خردنامہ جلالپوری

علی عباس جلالپوری

پیش لفظ

آج سے کم و بیش بیس برس پہلے مجلّہ ادبی دُنیا میں میرا ایک مضمون " دنیائے اسلام میں خِرد افروزی کی ضرورت " کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو میری کتاب " اقبال کا علمِ کلام " کا آخری باب ہے۔

مغربی ممالک میں اٹھارویں صدی میں ENLIGHTENMENT کی تحریک برپا ہوئی تھی۔ راقم السطور نے اس کا ترجمہ تحریک خِرد افروزی سے کیا۔ خِرد افروزی کی یہ تحریک ہالینڈ اور فرانس سے شروع ہوئی اور تمام مغربی ممالک میں پھیل گئی۔ اس کے ترجمانوں میں بیل، دیدرو، والٹیر، کندورسے، دولباخ، دی مابلی، کبانے، دالمبر اور مال تسکو مشہور ہوئے۔ سائنس کے فروغ کے ساتھ اہلِ علم نے محسوس کیا کہ علومِ جدیدہ کی روشنی میں ضروری ہے کہ انسانی معاشرے کی از سرِ نو تشکیل کی جائے اور تحقیقی علوم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دیدرو اور اس کے ساتھیوں نے ایک جامع قاموس العلوم مُرتّب کی قدرتاً اہلِ کلیسیا نے اس کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا لیکن اس کی اشاعت کو نہ روک سکے۔ اہلِ فکر نے محسوس کیا کہ رومانیت، باطنیّت اور نام نہاد رُوحانیت و مذہبی جُنون سے ہٹ کر سائنسی علوم کی روشنی میں معاشرۂ انسانی کو مدون کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی ممالک میں عقلیت پسندی اور خِرد افروزی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور علمِ کلام کے نام پر تقلیدِ جامد کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سائنس کے انکشافات کو ذہنی طور پر قبول

نہ کر سکے۔ دُنیائے اِسلام میں خِرد افروزی کی تحریک مامون الرشید کے زمانے میں "اعتزال" کے نام سے شروع ہوئی تھی لیکن تنگ نظر فُقہاء کی مخالفت کے باعث دم توڑ گئی۔ کوتاہ بیں اور تاریک دماغ فُقہاء نے مُعتزلہ کی کتابوں کو چُن چُن کر نذرِ آتش کیا اور اُن کو مذہبی جنون کا نشانہ بنایا۔ اہلِ مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی تحریکِ احیاء العلوم کا چرچا ہوا لیکن اسے علمِ کلام اور تقلید بے جا کی نذر کر دیا گیا۔ فقہا کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ عقلی علوم کو فروغ ہوا تو اُن کی دین فروشی اور دکان آرائی کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ یہ صُورت حال آج بھی موجود ہے۔ ہر سال اسلامی ممالک میں سیکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان کے موضوعات ہر اسلامی میں نقلی علوم تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کو لا مذہبیت اور الحاد کا سرچشمہ کہہ کر اُنہیں رد کر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں سائنسی علوم اور جدید مکاتیبِ فلسفہ کی اشاعت کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لئے راقم نے اپنی تصانیف میں خِرد افروزی اور روشن خیالی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک عقلیت پسندی کو تحکمات کی گرفت سے آزاد نہیں کیا جاتا، دُنیائے اسلام میں سائنس کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ خِرد افروزی کی اشاعت ہی سائنسی علوم کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے۔ خِرد افروزی کے ترکیبی عناصر درج ذیل ہیں

(۱) ـــــ عقلیّت پسندی کی ترویج۔

(۲) ـــــ سائنس اور فلسفے کو مذہبی تحکّم سے نجات دلانے کی کوشش۔

(۳) ـــــ انقلابیت، عقلیت پسندی یا سائنسی علوم کی روشنی میں معاشرے کو از سرِ نو مُرتبّ کرنے کی کوشش۔

(۴) ـــــ مذہبی منافرت اور جُنون کا انسداد۔

(۵) ـــــ انسان دوستی کا فروغ۔

ہمارے ہاں اِحیاء العلوم کے نام پر باطنیّت، تصوّف اور نام نہاد رُوحانیت کو ہر کہیں بڑھا

چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے اور اِحیا کے نام پر عوام کا ذہن گدلا کیا جا رہا ہے۔ اِحیا کا معنیٰ ہے مُردے کو زندہ کرنا۔ جب ہمارے اصحابِ فکر مذہب کے اِحیا کی بات کرتے ہیں تو گویا وہ یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ مذہب مر چکا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ریاست کا SECULAR ہونا اشد ضروری ہے۔

راقم نے BAYLE کی طرح علمی و تحقیقی نُقطۂ نظر سے اس لغات کی تدوین کی ہے اس کتاب کا ایک مقصد یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن و دماغ کو روشن کیا جائے اور اُنہیں تنگ دلی اور تنگ نظری سے نجات دِلا کر ایسے معلومات بہم پہنچائیں جائیں جن سے قاری کی نگاہ میں وُسعت اور ذہن و قلب میں کُشادگی پیدا ہو اور وہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کا جدید سائنس اور جدید فلسفے کی روشنی میں سامنا کر سکیں۔

علی عباس جلالپوری

یکم جولائی ۱۹۸۹ء
جہلم

ا

الف

یُونانی زبان کا الفا۔ ا بیل (کے سینگ) کی علامت تھی جو فنیقیوں نے حروفِ تہجّی مُرتّب کرتے وقت مِصری ہیروغلیفی سے اخذ کی تھی۔ بعد میں یہی حروفِ تہجّی صورتیں بدل بدل کر ایشیا اور یورپ کی بڑی بڑی زبانوں عبرانی، ارامی، حبشی، عربی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت میں رواج پا گئے۔ اہلِ مِصر دیوتا اوزیرس کے مُقدّس سانڈ ایپس کی پُوجا کرتے تھے جسے یونانی سیراپس کہتے تھے۔ ممفس کے شہر میں اُس کا مشہور معبد تھا۔ یہی تقدّس اُس کی علامت ا کے ساتھ بھی وابستہ ہو گیا۔ باطنّیہ کے ایک فرقے حُروفی نے ا کو وجودِ مطلق کی علامت قرار دیا کیوں کہ اُن کے خیال میں جس طرح کائنات کا صُدُور بتدریج وجودِ مطلق سے ہوا ہے اِسی طرح ا سے دوسرے حروفِ تہجّی ب، پ وغیرہ نِکلے ہیں۔ حُروفی الفبا کے حرُوف کو کائنات کے مختلف مظاہر کے رموز مانتے تھے۔ اس فرقے کے پیشوا فضل اللہ کو تیمور لنگ نے زندقہ کے الزام میں قتل کرا دیا تھا۔ صُوفیہ وجودّیہ نے ا کو ذاتِ مطلق اور محبوبِ ازلی کی علامت بنا دیا۔ پنجابی کے صُوفی شعرا کہتے ہیں کہ ہمیں صرف ایک وجودِ مُطلق سے غرض ہے، کثرت غیر حقیقی ہے اور بے معنی ہے۔ ا کے علاوہ ب، ت، وغیرہ جتنے حُروف ہیں وہ کثرت و تعدّد کو ظاہر کرتے ہیں جو صُوفیہ کے یہاں محض نظر کا فریب ہے۔ بلّھے شاہ ؎

مُلّاں مینوں سبق پڑھایا　　　الفوں اگّے کُجھ نہ آیا
اُوہ ب ای ب پُکاردا ائی　　　مُلّاں مینوں ماردا ائی

خواجہ غُلام فرید ؎

ہکو الف میںنوں بر مانوُم ڑی   تتیّ ب ت مُوں نہ بھانوُم ڑی

الف شاہی ملنگ اپنی پیشانی پر الف کا نشان بناتے ہیں اور گلے میں بغیر آستین کی الفی پہنتے ہیں۔ فارسی کے ایک شاعر ازرقی نے امیر طغان شاہ والئی نیشاپور کی قوّتِ رجولیتّ کو بحال کرنے کے لئے مثنوی الفیہ شلفیہّ لکھی تھی جس میں لِنگ کی علامت بن گیا ہے۔ عربی زبان میں سروقد لڑکی کو الفیہ کہا جاتا ہے۔

آبِ حیات

آبِ حیات، آبِ حیواں، چشمۂ حیواں کی دیو مالائی روایت بابل سے یادگار ہے۔ سنسکرت میں آبِ حیات کو امرت اور یوُنانی زبان میں امبروسیا کہتے ہیں۔ دونوں الفاظ کا معنیٰ ہے "غیر فانی"۔ اِنسان قدیم زمانے سے موت اور فنا پر قابو پانے کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ آبِ حیات یا امرت انہی خوابوں اور حسرتوں میں سے ایک ہے۔

اَبرِ نیساں

یہ بادل بہار کے موسم میں برستا ہے۔ کہتے ہیں کہ اِس کے قطرے سیپیوں میں جن کے مُنہ اِس موسم میں کھُل جاتے ہیں، گرتے ہیں اور موتی بن جاتے ہیں لیکن اِس روایت کی حقیقت شاعرانہ تلمیح سے زیادہ نہیں ہے۔

اِبلیس

یوُنانی زبان کے لفظ DIABOLOS سے نکلا ہے۔ انگریزی کا لفظ DEVIL اور فرانسیسی زبان کا DIABLE اس ترکیب کے پہلے حصّے سے اور ابلیس دوسرے حصّے سے ماخوذ ہے۔

اَبا سین

اٹک کے اوپر دریائے سندھ کو اَبا سِن کہتے ہیں یعنی دریاؤں کا باپ۔ اِسے مہران اور نیلاب کے نام بھی دئیے گئے ہیں۔ اِس کی پوُجا اَندرولال کے نام پر کی جاتی تھی۔ آج بھی سندھی اِسے ولی مانتے ہیں اور اِسے دریا شاہ کہتے ہیں۔

اَپیقوریّت

اپیقورس کا فلسفۂ لذتیت : وہ کہتا ہے کہ لذّت کا حصول ہی خیر ہے اور یہی انسان کا مقصدِ حیات ہونا چاہیئے لیکن وہ لذات میں فرق کرتا ہے ۔ اُس کے خیال میں نفسانی لذات گُریز پا ہوتی ہیں ۔ اِن میں مداومت کرنے سے اِنسان اُکتاہٹ اور بے زاری کا شکار ہو جاتا ہے اس لئے دانشمند ذوقی و فکری لذات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں جو ہمیں فنُونِ لطیفہ اور تدبّر و تفکّر سے میسّر آتی ہیں ۔ یہ لذات دیر پا ہوتی ہیں اور سادہ زندگی گذارنے سے مُیسّر آتی ہیں ۔ اپیقورس کہتا ہے کہ مستقبل غیر یقینی ہے کیا معلوم آئے یا نہ آئے اِس لئے حال کو با مسرّت طریقے سے گذارنا ہی قرینِ دانش ہے ۔ اپیقورس دیماقریطس کی مادیت پسندی سے متاثّر ہوا تھا ۔ اُس کے خیال میں ایٹموں کی حرکت جن سے اِس دنیا کی اشیاء بنی ہیں آزادانہ ہے لہٰذا اِنسان بھی فاعلِ مختار ہے اور حصولِ مسرّت پر قادر ہے ۔ اِنسان کی رُوح بھی دوسری اشیا کی طرح اپنی ماہیت میں مادی ہے اور موت کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے چنانچہ وہ حیات بعد ممات کا مُنکر ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے جسمانی اذیت اور درد سے پہلو بچانا مناسب ہوگا ۔ اُس کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ مسرّت ذہنی سکون ہی کا دوسرا نام ہے ۔

اپیقورس کے مخالفین نے اُس سے انصاف نہیں کیا جب اُنہوں نے کہا کہ وہ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی تعلیم دیتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے جسمانی لذات پر ذہنی و ذوقی آسودگی اور مسرّت کو ترجیح دی ہے ۔ زندگی کے اواخر میں اپیقورس گُونا گُوں امراض میں مُبتلا ہو گیا لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا ۔ اُس نے سو کے قریب رسائل لکھے تھے جو دستبُردِ زمانہ کا شکار ہو گئے ۔ اپیقورس مذہب کا مخالف تھا اور کہتا تھا کہ مذہب دہشت کی تخلیق ہے ۔ اِنسان قدیم زمانے سے موت اور فنا سے خائف رہا ہے ۔ اِس دہشت سے نجات پانے کے لئے اُس نے رُوح کی بقا اور حیات بعد موت کے تصورات کا سہارا لیا ۔ اُس کے خیال میں موت سے ڈرنا شیوۂ خرد مندی نہیں ہے کیوں کہ اُس کے الفاظ میں " جب تم ہو گے موت نہیں ہو گی ، جب موت ہو گی تم نہیں ہو گے " اپنی موت کے دن اُس نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا ۔

"میری موت کا یہ دن میری زندگی کا ایک بامسرت دن ہے۔ میرے معدے اور مثانے کے امراض شدت اختیار کر گئے ہیں اس کے باوجود میری تم سے جو باتیں ہوا کرتی تھیں اُن کی یاد میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔ مجھے توقع ہے کہ تم جو میرے لڑکپن کے دوست ہو اور چھوٹی عمر سے فلسفے کے شیدائی رہے ہو مٹرو ڈورس کے بچوں کا خیال رکھو گے۔"

مٹرو ڈورس اُس کا ایک عزیز شاگرد تھا جو دو ننھے بچے چھوڑ کر مر گیا تھا۔ ابیقورس نے اُن کی پرورش کی تھی۔ ابیقورس کے پیروؤں میں لاطینی شاعر لکریشیس قابلِ ذکر ہے۔ اُس نے اپنی مشہور طویل نظم میں مذہب کو انسان کے جملہ آلام و مصائب کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ مذہب کے نام پر انسان بے دریغ ایک دوسرے کا خون بہاتا رہا ہے اور مذہبی جنون نے مدہنہ انسانی میں صدیوں سے نفرت کا زہر گھول رکھا ہے۔

ابن رُشدیّت

ازمنۂ وسطیٰ میں اندلس کے فلسفی ابن رُشد کے افکار مغربی ممالک میں عام طور سے شائع ہو گئے تھے۔ اُس کے مسلکِ فکر کو ابن رُشدیّت اور اُس کے پیروؤں کو ابن رُشدی کہتے تھے۔ ابن رُشد کے اِس نظریے نے خاص طور سے اہلِ مغرب کو متاثر کیا تھا کہ صداقت دو گُونہ ہے: فلسفے کی صداقت اور مذہب کی صداقت۔ ابن رُشدی صدیوں تک پیرس اور اطالیہ کی دانش گاہوں میں اِس بات کا درس دیتے رہے کہ مذہب اور فلسفے کے حقائق یکساں طور پر اہم ہیں۔ نتیجتہً فلسفے کو مذہب کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔ فرانسس بیکن نے قطعی طور پر فلسفے کو مذہب سے جُدا کر دیا اور فلسفے کا مطالعہ بحیثیت ایک مُستقل شعبۂ علم کے ہونے لگا جس سے اہلِ مغرب آزادیٔ فکر و نظر سے رُوشناس ہوئے اور سائنس کی ترقی کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ دُنیائے اسلام میں مُلاؤں نے صداقت کے اِس دوگُونہ نظریّے کو رد کر دیا تھا اِس لئے ابن رُشد کے خیالات مشرق میں نفوذ نہ کر سکے نہ اہلِ مشرق جدید فلسفے اور جدید سائنس کے برکات سے آشنا ہو سکے۔

اپسرا

دیوتا اِندر کے بہشت کی حسین وجمیل پریاں ـــــ اوستا کی پریکا ـــــ جو سمندر کے بلونے سے نکلی تھیں۔ اِن کے دو طائفے ہیں دیویکا (آسمانی) اور لوکیکا (دُنیوی)۔ دیویکا تعداد میں دس ہیں اور لوکیکا کی تعداد چونتیس ہے۔ اَپسرائیں اِندر کو رجھانے کے لئے گندھروں (آسمانی گویّے) کے سازوں کی گت پر ترغیب آور اور ہوس پرور انداز میں بھاؤ بتا بتا کر کولہے مٹکا مٹکا کر چشم وابرو سے ذُومعنی اشارے کرتی ہوئی ناچتی ہیں۔ ہندو دیومالا کے قِصّوں میں رمبھا، منیکا، پرم لوچا، اُروسی، گھرتاچی وغیرہ اَپسراؤں کا ذکر آیا ہے۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ کسی رشی کے تپ جپ سے دیوتا اِندر کا سنگھاسن ڈولنے لگتا تو اِندر اُس رشی کو بہکانے کے لئے کوئی اَپسرا اُس کے پاس بھیج دیتا تھا چنانچہ اِسی مقصد کے لئے منیکا کو رشی وشوامتر کے پاس بھیجا گیا تھا رشی اُس پر فریفتہ ہوگیا۔ کالی داس کے ناٹک شکنتلا کی ہیروئین انہی کی بیٹی تھی۔ اِس کے پیدا ہوتے ہی منیکا واپس اِندر لوک چلی گئی تو پرندوں نے چوگا دے کر ننھی کو پالا جس سے اُس کا نام شکنتلا پڑ گیا کہ سنسکرت میں شکنت پرندے کو کہتے ہیں۔ بعد میں رشی کنو نے اُس کی پرورش کی جوان ہوئی تو راجہ دشینت نے اُس سے گندھرو بیاہ کر لیا۔ اُس کے بطن سے بھرت پیدا ہوا جس کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت رکھا گیا۔

اُپنشد

اُپنشد کا معنیٰ ہے قریب بیٹھنا یا خُفیہ تعلیم دینا۔ قدیم زمانے کے گُورو اپنے خاص خاص چیلوں کو اپنے قریب بٹھا کر انہیں خُفیہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ اُپنشدوں کی تعداد ایک سَو کے لگ بھگ ہے۔ اِن میں شوتیاشوتیر، برہادارنیاکا، کٹھ اور چھاندوگیہ مشہور ہیں۔ ان میں برہمن (آفاقی رُوح) اور آتما (انفرادی رُوح) کی ایکتا کی تعلیم دی گئی ہے یعنی دونوں اصلاً ایک ہی ہیں۔ تت ایکم (وہ ایک) حقیقی ہے، باقی جو کثرت دکھائی دیتی ہے وہ مایا ہے، نظر کا فریب ہے۔ جب کسی آدمی پر اِس حقیقت کا اِنکشاف ہو جائے کہ تتوم اسی (تو وُہ ہے) تو اُسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور اُسے سنسار چکّر سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ شنکر نے اُپنشدوں کے پریشان مباحث کو ایک مُحکم

منطقی نظام کی صورت میں مرتب کیا جو ویدانت کے نام سے مشہور ہوا۔ شہزادہ داراشکوہ نے پچاس کے قریب اُپنشد سِرِّاکبر کے نام سے فارسی میں ترجمہ کروائے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن میں جس کتاب مکنون کا ذکر آیا ہے اُس سے یہی اُپنشد مراد ہیں۔ داراشکوہ کے علاوہ البیرونی، شاہ غوث گوالیاری، شاہ عنایت قادری، مظہر جانجاناں اور مُلّا محسن فانی صاحب دبستان المذاہب نے اُپنشدوں اور صوفیہ وجودیہ کی وحدت الوجود میں مشترک عناصر کا ذکر کیا ہے۔

اتاترک

ترکی زبان میں اتا باپ کو کہتے ہیں۔ اتاترک یعنی ترکوں کا باپ مصطفیٰ کمال پاشا کو کہا جاتا ہے جس نے یونانیوں کو شکست دے کر ترکیہ کو تباہی سے بچایا تھا اور دور رس معاشرتی، قانونی، علمی اور لسانی اصطلاحات نافذ کر کے ترکوں کو ایک نئی قوم کی صورت میں منظم کیا تھا۔

آتن

فرعون امن ہوتپ چہارم ـــ بعد میں اس نے اپنا نام اخناتن رکھ لیا ـــ ۱۳۸۰ ق م میں مصر کے تخت پر بیٹھا۔ اُس نے خداوند خدا آمن کی پوجا کو منسوخ کر کے اُس کے پروہتوں کو کارنک کے بڑے معبد سے نکال دیا۔ کارنک میں سیکڑوں دیوداسیاں رہتی تھیں جو دیوتا آمن کی زوجیت میں دی جاتی تھیں لیکن فی الواقع پروہتوں کی ہوسناکی کی تسکین کرتی تھیں۔ اخناتن نے معبدوں میں جانوروں کی قربانیاں دینے سے منع کر دیا اور بُت تراشی و بُت پرستی کو ممنوع قرار دیا۔ اُس نے پروہتوں کی عیاری اور ریاکاری کا پردہ چاک کیا جو تعویذ گنڈوں اور جادو کے ٹونوں ٹوٹکوں کے کاروبار سے عوام کو لوٹ رہے تھے۔ اُس نے مندروں سے وقف کی ہوئی لاکھوں ایکڑ اراضی کو ضبط کر لیا جس سے پروہتوں کا ٹھاٹ باٹ ختم ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ معبدوں کی رسوم عبادت پروہتوں نے ذاتی منفعت کے لیے وضع کر رکھی ہیں۔ اُس نے کہا کہ خدا ایک ہے اور وہ آتن ہے جس کی علامت سورج ہے۔ آتن خالق ہے، پروردگار ہے، رحیم ہے کریم ہے۔ اخناتن نے تاریخ عالم میں پہلی بار واحدانیت کا تصور پیش کیا اور مذہب کو بُت پرستی اور رسوم عبادت

سے پاک کر دیا۔ بنی اسرائیل سے سات سو برس پہلے اُس نے کہا کہ خداوند آتن تمام اقوامِ عالم کا خدا ہے، سب انسانوں پر مہربان ہے۔ اُس کی جھلک پیڑوں اور پھولوں میں دکھائی دیتی ہے اور زندگی کی تپش اور ہر قسم کی نشوونما اُسی کے دم سے ہے، اُسی کے اثر سے "ننھے" میمنے اُچھلتے کودتے ہیں اور پرندے سرکنڈوں میں پَر پھڑپھڑاتے ہیں۔" اِخناتن نے آتن کے مجسّمے تراشنے سے منع کر دیا اور کہا کہ سچّے خدا کی کوئی خاص شکل و صُورت نہیں ہوتی۔ اخناتن کی اپنی زندگی مثالی تھی۔ اُس کی ایک ہی زوجہ تھی۔ ملکہ نوفرے تیت جس سے وہ دِلی محبت کرتا تھا اور اپنی سات بیٹیوں کا مہربان باپ تھا۔ اُس نے آتن کے نام سے ایک شہر بھی بسایا لیکن اُس کی موت کے بعد پروہت دوبارہ حاوی ہو گئے اور اِخناتن کا نیا مذہب منسوخ کر دیا گیا۔

اٹک

اٹکا سے ہے یعنی رُک گیا۔ آریا وادی گنگ و جمن میں جا کر آباد ہو گئے تو اُنہوں نے دریائے سندھ کو عبور کرنے پر قدغن لگا دی جس سے اس کا نام اٹک پڑ گیا۔ برہمنوں نے کہا کہ جو کوئی اِس دریا کو عبور کرے گا سیدھا دوزخ میں جائے گا۔

احدیّت

کائنات کی اصل ایک ہے، کثرت محض اعتباری ہے۔ سپینوزا، فلاطینوس، شنکر اور برگساں کے نظریات احدیّت کی مختلف صُورتیں ہیں۔ احدیّت میں دُوئی یا کثرت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ احدیّت سامی مذاہب: مُوسویّت، عیسائیت اور اِسلام کے اِلٰہیاتی تصوّر کے منافی ہے کیوں کہ اِن مذاہب میں خدا اور مادے یا خالق اور مخلوق کی دُوئی بُنیادی حیثیّت رکھتی ہے۔

اِحرام

اِحرام کا معنیٰ ہے حرام کر لینا یعنی بعض جائز باتوں کو مقررہ جگہوں سے حج کے تمام ہونے تک اپنے آپ پر حرام کر لینا۔ اِحرام باندھنا: بغیر سِلی ہوئی چادریں اوڑھ لینا۔ اِسلام سے پہلے عورتیں مرد برہنگی کی حالت میں سیٹیاں بجاتے ہوئے کعبہ کے سات چکّر لگایا کرتے تھے۔ بنو ہاشم نے اِحرام باندھنے کا طریقہ رائج کیا۔

اِحیاء العلوم

عُلوم کو زندہ کرنا ۔ اِسے نشاۃ الثانیہ (نیا جنم) بھی کہا جاتا ہے ۔ اِس تحریک کا آغاز چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں اطالیہ کے شہروں میں یونانی عُلوم کی تدریس سے ہوا ۔ ترکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو وہاں کے کچھ پڑھے لکھے لوگ ارسطو ، دیماستھینیز ، یوری پیڈیز وغیرہ کے مسودات لے کر فلورنس چلے گئے اور یہ شہر کلاسیکی علوم کی تدریس کا مرکز بن گیا ۔ یہاں کا مشہور دیمچی خاندان اساتذہ کی سرپرستی کرنے لگا ۔ کوسیمو دیمچی نے فلورنس میں اکادیمی افلاطون قائم کی جس میں افلاطون کا فلسفہ پڑھانے لگے ۔ لوگ تحصیلِ علوم کے شوق میں دور دراز کے ممالک سے سفر کر کے فلورنس ، پیڈوا اور روم کی درس گاہوں میں ہجوم کر آئے ۔ اطالیہ میں یہ تحریک زیادہ تر فلسفہ ، ادبیات اور فنونِ لطیفہ تک محدود رہی ۔ پٹرارک اِس تحریک کا سب سے بڑا علم بردار تھا ۔ شمالی اور مغربی یورپ کے شہروں میں اِس کے سائنسی پہلو کو فروغ ہوا ۔ کوپرنیکس ، گلیلیو ، نیوٹن اور کپلر نے ہیئت اور طبیعیات میں انکشافات کئے اور فرانسس بیکن ، دے کارت اور ہابس نے نئے فلسفے کی بنیاد رکھی ، تحقیقی علوم کو چھاپہ خانے نے فروغ بخشا ۔ اہلِ فکر کا ذہن کلیسائے رُوم کی صدیوں سے عائد کی ہوئی پابندیوں سے آزاد ہو گیا اور مذہبی توہمات و تعصبات کی تاریکیاں چھٹ گئیں ۔ بیکن نے ارسطو کی منطق قیاسی پر پُر مغز نقد لکھا اور ثابت کیا کہ یہ منطق تحقیقِ علمی کے راستے میں صدیوں سے حائل رہی ہے ۔ دُنیائے ادب میں ایراسمس ، مور ، مونتین اور شیکسپیر جیسے عقلا نے نئے نئے اسالیب وضع کئے ۔ میکائل آنجلو ، رافیل ، طلیان ، داونچی وغیرہ نے مصوری کے شاہ کار پیش کئے ۔ سٹریڈی ویریس نے نئی موسیقی کی بنیاد رکھی ۔ اِس تحریک کے بارے میں مورخ ڈین لون لکھتا ہے ۔

" لوگوں کو ایک بار پھر محسوس ہوا کہ زندگی بڑی نعمت ہے اور محض زندہ رہنا ہی بہت بڑی مسرت کا باعث ہے ۔ یہ نتیجہ تھا یونانی فلسفے کے احیاء کا جس نے ذہنوں پر صدیوں سے جمی ہوئی رہبانیت کی پھپھوندی کو دُور کر دیا ۔ "

آزادیِ فکر و نظر کے ولولے سے سرشار ہو کر کولمبس ، میجی لان اور واسکو ڈا گاما نے دُور دراز کے

پُرخطر بحری سفر کیے۔ یہی ولولۂ حیات اور یہی جوششِ زندگی نشاۃ الثانیہ کی رُوح ہے۔ اربابِ نظر حجروں اور خانقاہوں میں زاویہ نشین ہو کر طلبِ نجات کرنے کے بجائے اپنے گردوپیش کی زندگی سے دلچسپی لینے لگے اور اِس کے مسائل اور عقدوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ وہ نگاہیں جو ایک ہزار برس سے فلاح و بہبود کی جستجو میں آسمان کی طرف لگ رہی تھیں پھر زمین کی طرف لوٹ آئیں اور اِسی زمین پر فردوسِ گم گشتہ کی تلاش شروع ہو گئی۔

اِختلالِ ذہن

تحلیلِ نفسی کی رُو سے آدمی اُس وقت خللِ ذہن میں مُبتلا ہوتا ہے جب اُس کی شعوری رَو کے تسلسل میں فرق آجاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ذہن ہر وقت حرکت اور سیلان میں رہتا ہے حتیٰ کہ سوتے جاگتے میں بھی اُس کا عمل جاری رہتا ہے جس کے باعث ہم خواب دیکھتے ہیں۔ ابھی ہم آج کی کوئی بات سوچ رہے ہوتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے میں ہمارا خیال اپنے بچپن کے کسی واقعے کی طرف مُنتقل ہو جاتا ہے اور پھر معاً ہم مستقبل کے اِرادے باندھنے لگتے ہیں۔ یہی ذہن کی سیلانی حرکت ہے جو ہماری نفسیاتی صحت مندی کو بحال رکھتی ہے۔ جب کبھی ہماری ذہنی اُلجھنیں جنہیں ہماری اَنا یا ہمارا شعور ہمارے لاشعور میں دبائے رکھتا ہے، بے اختیار ہمارے شعور کی سطح پر اُبھر آتی ہیں تو شعور کی رَو مُتاثر ہو جاتی ہے، اُس کی سیلانی حرکت میں فرق آجاتا ہے اور ہمارا ذہن کسی ایک ہی سوچ پر اِس طرح جامد ہو جاتا ہے کہ اُس کے بغیر کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہی خللِ ذہن کی علامت ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے یہ حالت شاذ و نادر ہی برقرار رہتی ہے اور ہمارے ذہن کی سیلانی حرکت بحال ہو جاتی ہے۔ یہ حرکت مستقلاً منقطع ہو جائے تو خللِ ذہن کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جس کی کئی صورتیں ہیں۔ (۱)۔۔۔ ہسٹریا (۲)۔۔۔ عصبی المزاجی، پژمُردگی، منقسم شخصیت اور جسم کے مختلف اعضاء میں درد کی شکایت اِس کی علامتیں ہیں۔ (۳)۔۔۔ فتورِ ذہن: جس میں نامعلوم اندیشے اور خوف شامل ہیں منجملہ یہ کہ ساری دُنیا میری دشمن ہے اور سب لوگ میرے درپے آزار ہیں۔ (۴)۔۔۔ تشویش: آدمی بلا کسی معقول وجہ کے ہر وقت تشویش میں مُبتلا رہتا ہے مثلاً یہ کہ کمرے کی چھت مجھ

پر گر پڑے گی یا ٹرین جس میں میں سفر کر رہا ہوں حادثے کا شکار ہو جائے گی اور ان اندیشوں کے ساتھ آدمی اپنی موت کے مناظر کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ (۵)۔۔۔ ہر وقت اپنی بیماری کا رونا روتے رہنا۔ اس کی تہ میں رحم طلبی ہوتی ہے جو دماغی کمزوری کی علامت ہے۔ خلل ذہن کا علاج تحلیل نفسی سے کیا جاتا ہے لیکن اب ایسی مسکن دوائیں تیار کر لی گئی ہیں جو اکثر حالتوں میں مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔

اخلاطِ اربعہ

چار اخلاط کا یہ تصور طب یونانی کے بانی ہپوقراطیس (بقراط) سے یادگار ہے۔ انہی کی بنا پر چار مزاج معین کئے گئے ہیں۔ دموی، بلغمی، صفراوی اور سوداوی۔ دم عربی میں خون کو کہتے ہیں۔ دموی مزاج والے کے جسم میں خون صالح بافراط ہوتا ہے اس لئے وہ تندرست اور توانا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوتے ہیں۔ نہایت چاق و چوبند، خط پسند اور بلند نظر ہوتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر رجائی ہوتا ہے اور وہ زندگی سے پوری طرح تمتع کرتا ہے۔ اکثر اصحاب عزم و عزیمت اس مزاج کے ہوتے ہیں۔ بلغمی مزاج والا سفید فام اور فربہ اندام ہوتا ہے۔ خوش مزاج لیکن کاہل اور آرام طلب ہوتا ہے، زیادہ تگ و دو اور بھاگ دوڑ سے گریز کرتا ہے، ہر ایک سے مسکرا کر بات کرتا ہے اور خوش رہو اور خوش رہنے دو کا قائل ہوتا ہے۔ صفراوی مزاج والے کا رنگ زرد ہوتا ہے، اس کا جسم دبلا پتلا ہوتا ہے، نہایت حساس اور زود رنج ہوتا ہے۔ بات بے بات جھگڑے اور اختلاف کا کوئی نہ کوئی عنوان پیدا کر لیتا ہے جسمانی لحاظ سے توانا نہیں ہوتا اور سرکہ جبینی کے باعث اچھا دوست نہیں بن سکتا۔ جفاکشی اور ہمت کوشی اس میں نہیں ہوتی اور طبعاً حاسد ہوتا ہے۔ سوادی مزاج والے کے چہرے کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے وحشت جھلکتی ہے اور میل جول سے گھبراتا ہے۔ تنہائی پسند ہوتا ہے اور اکثر گم سم اور کھویا کھویا رہتا ہے، گہری نیند سے محروم ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت پر افسردگی کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھتا ہے۔ روس کے مشہور عالم عضویات پاولوف نے ایک مدت تک کتوں پر تجربے کئے اور ہپوقراطیس کے چار مزاجوں کے اس نظریے پر صاد کیا تھا۔

اِخلال

لغوی معنیٰ میں نقصان پہنچانا، محتاج کرنا۔ اِنتقاد کی اِصطلاح میں اِس کا مطلب ہے کسی شعر میں الفاظ کو یوں بے ترتیب اور مضمون کی کڑیوں کو یوں غیر مربوط کر دینا کہ شعر کا مفہوم خبط ہو جائے۔ یہ خامی مُتشاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جو قادر الکلام نہ ہونے کے باعث اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار صاف سیدھے پیرائے میں نہیں کر سکتے ہیں اور اپنے اہمال و اِبہام پر فکر کی گہرائی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِخلاقیات

اِخلاقیات یا اِخلاق کا فلسفہ شروع سے فلسفے کا ایک اہم شعبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اخلاقیات انسانی اعمال کے مقاصد کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لئے اُصولوں کے تعیّن کا عِلم ہے۔ اِس میں خَیر کی ماہیت سے بحث کی جاتی ہے اور اُس کے حصول کے وسائل کا تجزیہ کر کے بتایا جاتا ہے کہ وہ کس حد تک خیر کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ قدمائے یُونان کے خیال میں مَسرّت کا حصول ہی اِنسانی زندگی کا واحد مقصد ہے البتہ مَسرّت کے معانی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سُوفسطائی اور اُن کے ہم نوا کہتے تھے کہ مَسرّت جذبات اور حواس کی تسکین سے میسّر آتی ہے جب کہ سُقراط اور اُس کے پیرو عقل اِستدلالی کو مَسرّت کے حصول کا وسیلہ مانتے تھے۔ سُوفسطائیوں کے ہم خیالوں کو بعد میں لذّت پسند کہا گیا جس کی بہترین مثال ابیقورس تھا۔ افلاطون نے حُسن اور صداقت کی طرح خیر کو بھی قدرِ اعلےٰ قرار دیا اور کہا کہ حُسن اور صداقت کی طرح خَیر کا حصول بھی عقل اِستدلالی ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ افلاطون نے لذّت کو مَسرّت کا عُنصرِ ترکیبی ماننے سے انکار کیا۔ اِس کے مکالمات میں سُقراط کہتا ہے کہ عِلم ہی خَیر ہے یعنی جو شخص خَیر کا عِلم رکھتا ہو وہ کوئی غیر اخلاقی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اِس پر گرفت کرتے ہوئے ارسطو نے کہا کہ سقراط نے جذبات و احساسات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اُس کے بقول یہ بات عین ممکن ہے کہ آدمی خَیر کی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی جذبات کے جوش میں آ کر غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کر بیٹھے۔ ارسطو نے حفظِ نفس کی اہمیّت سے انکار